

رسول اللہ بحیثیت ایک مدبر

—: محمود احمد غازی :—

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے کسی پہلو پر گفتگو کرتے وقت یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ حضور علیہ السلام کی سیرت تاریخ انسانی کی جامع ترین اور کامل ترین شخصیت کی سیرت ہے۔ یہ سیرت پوری دنیا کے لئے واحد نمونہ ہدایت ہے جس میں ہر قسم کے انسانوں کے لئے ہدایت موجود ہے۔ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو صحیح اور مکمل رہنمائی یہیں سے مل سکتی ہے۔ حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے لئے سرکارِ مدینہ ہی کی سیرت نمونہ بن سکتی ہے، کوئی کسی بیوی کا شوہر ہو تو اس کو چاہیے کہ اہمات المؤمنین کے پاکباز شوہر سے ہدایت حاصل کرے، کوئی صاحبِ اولاد ہو تو اس کو صرف فاطمہ، رقیہ اور ابراہیم کے والد اور حسن و حسین اور امامہ کے نانا کی زندگی سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ ایک معلم اور مدرس کو چاہیے کہ وہ دارالقرم اور صفحہ کے معلم سے سبق حاصل کرے، سپہ سالاروں اور صاحبانِ سیف و سنان کو اگر کہیں سے کوئی نمونہ ہدایت مل سکتا ہے تو صرف سالارِ بدر و حنین کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ ایک فاتح جبریل کی کیا شان ہونی چاہیے۔ یہ صرف فاتحِ کتبہ کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک مدبر اور سیاست دان کے لئے کیا اسوہ حسنہ ہونا چاہیے۔ یہ اس کو صرف صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط پر گفتگو کرنے والے مدبر اور بیباک مدینہ مرتب کرنے والے سیاست دان کے ہاں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مدبر اور سیاست دان ہونا آپ کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سے محض ایک ادنیٰ پہلو ہے۔ اس پر گفتگو کرتے وقت حضور کی اصل اور برتر حیثیت نظروں سے اوجھل نہ ہونی چاہیے۔ آپ کی اصل حیثیت بہر حال ایک نبی مرسَل اور فرستادہٴ خداوندی ہے جو روزِ قیامت تک عالمِ انسانیت کے سامنے اللہ رب العزت

خانی کائنات کا واحد نمائندہ مجاز اور ترجمان مرضی الہی ہے جس کا اصل وظیفہ تلاوت آیات تزیئہ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ باقی سارے وظائف اور پہلو اسی اصل الاصول کے نوازم و فروع ہیں۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کیا اور جس پہلو سے بھی کیا اس میں اصل اور بنیادی حیثیت ایک نبی اور رسول ہی کی تھی اور یہی فرائض نبوت آپ کے پیش نظر تھے۔

ایک مدبر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر نظر ڈالنے سے قبل بہتر ہوگا کہ ایک نظر اس عظیم مقصد پر بھی ڈال لی جائے جس کا حصول آپ کے پیش نظر تھا اور جس کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے اپنی ساری عمر کھپائی اور نہایت اعلیٰ بصیرت اور کمال تدبیر کے ساتھ اس مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ایک نبی کی حیثیت سے حضور کا کام یہ تھا کہ اول لوگوں تک خدا کی ہدایت اور دین حق کی دعوت پہنچائیں، جو لوگ آپ کی اس دعوت کو قبول کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوتے جائیں ان کے ذریعہ ایک امت مسلمہ کی تشکیل ہو، یہ امت مسلمہ زمین پر اللہ کی حجت و برہان قرار پائے، اس کے جملہ انفرادی اور اجتماعی نظامات اسلام کی بنیادوں پر قائم ہوں، اس کے تمدن کی اساس قرآن و سنت پر ہو، یہ امت دنیا میں عدل و انصاف کی علمبردار ہو اور زبان حال اور زبان حال سے شہادت حق کا عظیم نشان فریضہ سرانجام دے، حق و باطل کا معیار وہی اصول قرار پائیں جن پر اس امت کی اساس ہو، اقوام عالم کی فکری اور تہذیبی رہنمائی کا منصب اس امت کا حاصل ہو، یہ امت اپنے اصولوں پر دنیا بھر کی اصلاح کے لئے کوشش کرے اور دنیا کے انسانوں تک دین حق کی دعوت کو پہنچائے، حق و باطل کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرے اور اس طرح دنیا میں اللہ کی حجت تمام ہو جائے لیھلک من ھلک عن بینۃ۔ ویحیی من حی عن بینۃ۔ جو ہلاکت میں پڑنا چاہے وہ (سوچ سمجھ کر) دلیل کے ذریعہ ہلاک ہو اور جو (ہدایت کے مطابق) زندہ رہنا چاہے وہ بھی (علی وجہ البصیرت) دلیل کے مطابق زندہ رہے۔

یہ تھا وہ عظیم نشان مقصد اور مشن جس کے حصول کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سال کی جان گسل جدوجہد کی، دنیا بھر کی باطل قوتوں سے پنجہ آزمانی کی اور ہر طرح کی تکلیف کو برداشت کیا۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے حضور نے اپنی ساری صلاحیتیں کھپا ڈالیں۔ فاقے پھیلے تو اسی لئے۔ تلوار اٹھائی تو اسی مقصد سے، سیاسی گفت و شنید کی تو اسی غرض سے،

گھر بار چھوڑا تو اسی مقصد کے پیش نظر حتیٰ کہ اکثر و بیشتر شادیاں بھی اسی جذبہ سے کیں۔
 اس جہم میں حضور علیہ السلام نے اپنے مخالفین سے کس طرح مقابلہ کیا، کس حکمت عملی سے
 یہ عظیم کارسرا انجام دیا اور کس کامیابی سے مختلف سیاسی تدبیریں استعمال فرمائیں۔ یہ صرف سیرت نبوی
 کا ایک بہت دلچسپ حصہ ہے بلکہ اس میں آج کے مدبرین اور سیاست کاروں کے لئے
 بھی رہنمائی موجود ہے۔

چونکہ حضور علیہ السلام رحمۃ للعالمین اور محسن انسانیت بلکہ محسن اعدائے تھے۔ اسی لئے
 آپ کی پالیسی کا بنیادی جوہر یہ تھا کہ مخالفین کو نیست و نابود کرنے کے بجائے ان کو سیاسی
 اعتبار سے بے اثر اور فوجی اعتبار سے بے دست و پا کر دیا جائے اور ان کے سیاسی زور اور
 عسکری قوت کو صرف اس حد تک توڑ دینے پر اکتفا کیا جائے کہ وہ نظام اسلام اور حکومت اسلام
 کیلئے کسی درجہ میں بھی خطرہ نہ بن سکیں تاکہ دین حق کو ایسی حیثیت حاصل ہو جائے کہ ادیان باطلہ
 نہ تو اس کو شکست دے سکیں نہ اپنے سامنے جھکا سکیں اس ضمن میں آپ کی کوشش یہ ہوتی تھی
 کہ دشمنان اسلام پر اسلام اور اسلامی حکومت کا رعب اور دبدبہ قائم کر دیا جائے۔ خود
 قرآن مجید میں بھی کفار پر رعب اور دبدبہ کے قیام کو اسلامی حکومت کی عسکری پالیسی کا مقصد
 بتایا گیا ہے۔ سورۃ انفال کی آیت ہے، **وَأَعِدُوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ
 الْجَحِيلِ تَرَهُبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخِرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُوهُمْ اللَّهُ يَخْلِبُ
 أَعْيُنَ النَّاسِ وَيَأْتِيهِمْ فِي الصُّبْحِ** اور ان لوگوں کے مقابلہ کے لئے جس قدر قوت اور فوجی ساز و سامان (گھوڑے وغیرہ) تم سے ممکن
 ہو سکے تیار کر رکھو، تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں کو اور ایسے دوسرے بہت سے لوگوں
 کو جن کو تم نہیں جانتے اور جن کو اللہ خوب جانتا ہے ڈرا کر رکھ سکو اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلعم کو
 بھی کفار پر خصوصی رعب اور دبدبہ عطا فرمایا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا نصرت
 بالرب رعب مسیوۃ شہر یعنی ایک ماہ کی مسافت ہی سے دشمن کے دل میں میرا رعب بیٹھ
 جاتا ہے اور یہ صرف میرے لئے خصوصی نصرت الہی ہے۔

اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا طریقہ کار اور مخالفین اسلام کے ساتھ آپ کا رویہ ایک
 فاتح کے بجائے ایک داعی اور مشنری کا تھا۔ آپ کی تمام جنگوں اور مدبرانہ اقدامات میں ایک

جنگجو کا نڈر کے بجائے ایک معلم کی رحمدلانہ شان پائی جاتی ہے۔ یہ آپ کی داعیانہ رحمدلی اور معلمانہ شفقت ہی تھی کہ ابو جہل جیسے الداعیاء اسلام کے لئے بھی آپ آخر وقت تک قبولِ اسلام کی دعا کرتے رہے۔ دوسری طرف اس داعیانہ شان کے اثرات و ثمرات بھی دیکھئے کہ دشمنانِ اسلام کی صفِ اول سے ایک شخص نکلا اور اسلامی کمیپ میں آکر فاروقِ اعظم کے جلیل المقدر مرتبہ پر فائز ہو گیا۔

دشمن کو سیاسی طور پر بے اثر کر دینے کی یہ پالیسی خاص طور پر مدنی زندگی میں جگہ جگہ اور قدم قدم پر کارفرما نظر آتی ہے۔ آپ نے جس قدر بھی عملی خطوط مرتب کئے وہ سب اسی پالیسی کے ماتحت تھے۔ مدینہ میں دفاعی قوت کی تنظیم و تشکیل اسی بنیاد پر ہوئی۔ مکہ والوں کی بخاری اور معاشی ناکہ بندی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ان لوگوں کے زور کو اس حد تک ختم کر دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کو کوڑی نگاہ سے نہ دیکھ سکیں، مختلف قبائل عرب سے جنگ نہ کرنے کے باہمی معاہدے کئے گئے، فتح مکہ کے بعد طائف کا محاصرہ بھی اسی غرض سے اٹھا لیا گیا کہ اب یہ لوگ بہر حال نہ تو اس قدر زور آور ہو سکتے ہیں کہ اسلام کے لئے کوئی بڑا خطرہ پیدا کر سکیں اور نہ اسلام کی ہمہ گیر رو سے زیادہ دیرالگ رہ سکتے ہیں۔ اس طرح غزوہ تبوک کے موقع پر جب قیصر روم نے از خود حملہ نہ کیا اور واپس ہو گیا تو آپ نے بھی پیش قدمی سے احتراز کیا اور تبوک کے آس پاس بسنے والے قبائل سے مختلف معاہدے کر کے واپس چلے آئے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے سختی سے اس کی ممانعت فرمائی کہ مسلمان فوجیں از خود کسی پر ہتھیار نہ اٹھائیں اور حتی الامکان اس امر کی کوشش کریں کہ پُر امن طور پر مکہ میں داخل ہو جائیں۔ اس ضمن میں حضور صلعم کے تاکید کی احکامات کا یہ عالم تھا کہ جب اسلامی لشکر کے ایک ذمہ دار افسر نے یہ نعرہ لگایا: "آج معرکہ کا دن ہے اور آج کعبہ کی حرمت کو حلال کیا جائے گا" تو آپ نے فوراً ان کے ہاتھ سے کمان اور جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کے سپرد کر دیا۔ یہ سب واقعات اسی پالیسی کے مظہر ہیں۔

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف آوری کے دو سال کے اندر اندر حضور علیہ السلام نے مدینہ کے آس پاس قیام پذیر قبائل سے بہت سے سیاسی معاہدے کئے کچھ قبائل سے باقاعدہ دفاعی معاہدے بھی عمل میں آئے جن میں طے پایا کہ مسلمان اور وہ قبائل برونی

حملوں کی صورت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ بعض قبائل کے ساتھ صرف اتنی بات پر سمجھوتہ ہوا کہ وہ اعدائے اسلام کے ساتھ کسی نوعیت کا تعلق نہ رکھیں گے، کچھ قبائل سے یہ بھی طے پایا کہ اگر مسلمانوں پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ بعد میں بھی آپؐ کی یہ ایک مستقل پالیسی رہی کہ حلیفانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ توسیع دی جائے چنانچہ غزوہ تبوک کے موقع پر جب قیصر روم واپس ہو گیا اور مسیح معرکہ آرائی کی نوبت نہ آئی تو آپؐ نے تقریباً ایک ماہ اس علاقہ میں قیام فرمایا اور متعدد مقامی قبائل سے مختلف قسم کے معاہدے کئے۔

حلیفانہ تعلقات کی اس توسیع اور مختلف قبائل عرب سے کئے جانے والے ان معاہدوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مدینہ کی اسلامی ریاست کو سارے عرب میں ایک مرکزیت حاصل ہو گئی بلکہ وہ عرب کی سیاست کا مرکزِ ثقل بن گئی اور کسی مخالف قوت کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ مسلمانوں کو لقمہ تر سمجھ کر آسانی سے ہضم کر لے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سال کے نہایت قلیل عرصہ میں آپؐ نے اپنا عظیم الشان مشن نہایت کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ حضورؐ کا براہِ پا کردہ انقلاب تاریخِ انسانی کا نہ صرف کامیاب ترین اور کٹل ترین انقلاب ہے بلکہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے زیادہ پر امن انقلاب بھی ہے۔ ایک طرف اس انقلاب کی جامعیت اور سہمہ گیری کو دیکھئے، دوسری طرف ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کو پیش نظر رکھیں جن کا حضورؐ کو سامنا کرنا پڑا، پھر ۲۳ برس کی قلیل مدت! ان باتوں کے علاوہ کم سے کم انسانی خون کی قربانی! اس کو صرف مجروحہ نبوی ہی کہا جاسکتا ہے۔ فرانس کے نام نہاد، ناقص اور بڑبڑوٹنگ سے بھرپور انقلاب کو دیکھئے، کتنے بے گناہ انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں، کتنوں کی جائیدادیں ٹپٹیں اور برس ہا برس افراتفری اور فوضویت کی نذر ہو گئے اور نسلِ آدم کو بحیثیتِ مجموعی حاصل کیا ہوا؟ یہی بلکہ اس سے بھی بدتر حال موجودہ صدی کے اشتراکی انقلاب کا ہے۔

دوسری طرف محمدی انقلاب کا جائزہ لیجئے، جس نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو بدل دیا، خیر و شر کے معیار بدل دیئے، تہذیب و تمدن کی اقدار بدل ڈالیں معاشرت

و معیشت کے نئے نظام قائم کر دیئے اور وہ سب کچھ کر دیا جو ایک ہمہ گیر اور مکمل انقلاب کے لئے ضروری ہے۔ مکہ میں حضور علیہ السلام نے تیرہ سال تک سخت جاں نسل حالات میں اسلام کی تبلیغ کی، جب آپ نے ہجرت فرمائی تو مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً ساڑھے چھ سو تھی۔ مدینہ میں تقریباً دو سو، مکہ میں چار سو تیس پنہتیس کے لگ بھگ اور حبشہ میں کچھ اوپر سو مسلمان تھے۔ ہجرت کے بعد پہلی عید کے موقع پر ۲ ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں مردم شماری کرائی تو سات سو کے قریب مرد تھے، اتنی ہی عورتیں فرض کر لی جائیں تو ۲ ھ میں دنیا بھر میں کل مسلمان زیادہ سے زیادہ دو ہزار بنتے ہیں۔ یہ تھی وہ افرادی قوت جس کو ساتھ لے کر حضور نے کام شروع کیا۔ قیام مدینہ کے دوران حضور نے کل سترہ غزوات میں حصہ لیا، ۳۳ سرایا بھیجے، تقریباً گشتی دستے وقتاً فوقتاً ارسال فرمائے، دو سو نو وود کو باریاب فرمایا، مختلف قبائل عرب سے معاہدے کئے (جن کی تعداد شاید ۲۵-۳۰ بنتی ہے) سو کے قریب تبلیغی و سیاسی سفراء بھیجے۔ بے شمار تبلیغی و سیاسی خطوط لکھے جن میں تقریباً چار سو خطوط کے متن ثواب تک دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تین سو قبائلی سرداروں سے بیعت لی۔

ان سب سیاسی و عسکری اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب آپ حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ فرزند ان اسلام ہمراہ تھے۔ وفاتِ طیبہ جب ہوئی تو ساڑھے نو لاکھ مربع میل رقبہ پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا اور قریب قریب دس لاکھ افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ لیکن اس پوری ہمہ میں کتنی انسانی جانوں کی قربانی دی گئی۔ یہ بات بڑی حیرت اور نہایت دلچسپی کا باعث ہو گی کہ اس ساری ہمہ میں صرف چودہ سو افراد کا خون بہا۔ سارے غزوات اور جنگوں میں چار سو سے کچھ کم ہی صحابہؓ نے جامِ شہادت نوش کیا اور نو سو سے کچھ زائد کا فرما رہے گئے۔

یوں تو ہمارا ایمان و ایقان ہے کہ یہ عظیم الشان کامیابی صرف اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ اگر اس کی نصرت اور اس کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو ہرگز ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ ہو سکتی تھی، لیکن یہ کام اس نے بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا اور آپ کو

وہ ساری صفات، صلاحیتیں اور خوبیاں عطا فرمائیں جن سے حضورؐ نے اس مہم میں کام لیا۔

اس ضمن میں سب سے پہلی چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ برتر اخلاق اور وہ زبردست اخلاقی رُعب ہے جو مخالفین کو ٹھکنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ ایک سیاسی تدبیر کے تدبیر کی کامیابی کا انتہائی کمال ہے کہ وہ اپنے مخالفین کے دلوں کو اپنے حسن اخلاق سے مسخر کر لے۔ حضورؐ کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے جب آپ کے مخالفین نے آپ کے اخلاقی رُعب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ قیام مکہ میں جس زمانہ میں کفار کی طرف سے ظلم و تشدد اپنی انتہا پر تھا ابھی دنوں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، قریب ہی کفار کی ایک ٹولی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ نشانہ تمسخر ایک ایسا شخص تھا جس کی کچھ رقم ابو جہل کے ذمہ واجب الادا تھی۔ کسی شخص نے یونہی برسبیل تمسخر قرض خواہ سے کہہ دیا کہ تمہارا قرض یہ صاحب دلاؤں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدعا عرض کیا۔ حضورؐ نے ذرہ برابر تامل نہ فرمایا اور اس شخص کو لے کر ابو جہل کے گھر کی طرف چلے۔ یہ ساری ٹولی بھی تماشا دیکھنے کی غرض سے پیچھے پیچھے ہوئی۔ حضورؐ ابو جہل کے گھر پہنچے اور آواز دی۔ ابو جہل باہر نکلا اور آپ کو موجود پا کر حیران رہ گیا۔ آپ نے فرمایا اس شخص کا قرض ادا کر دو۔ ابو جہل اس قدر مبہوت اور مرعوب ہوا کہ ذرا تامل نہ کر سکا اور فوراً اس شخص کا قرض ہی اس کو ادا کر دیا۔

کفار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی رُعب کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال ہوگی کہ جب وہ اجتماعی طور پر آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آئے اس وقت بھی ان کی امانتیں آپ کے پاس اسی گھر میں موجود تھیں جس کا وہ محاصرہ کئے کھڑے تھے۔ ناممکن تھا کہ وہ کفار بے حول سے حضورؐ کی دیانت و امانت کے قائل اور اپنے عمل سے اس کے گواہ تھے سیاسی طور پر حضورؐ کے سامنے ٹھہر سکتے اور آپ کے مقابلہ میں کسی قسم کی کامیابی حاصل کر سکتے۔

دوسری بڑی صفت جو ایک قائد یا تدبیر میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ جس رویت اور جس قربانی کا دوسروں سے مطالبہ کرتا ہو خود اس پر اوردوں سے بڑھ کر عمل کرتا ہو۔ ایسا قائد

جو خود اپنے کئے پر عمل نہ کرتا ہونا ممکن ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک اپنے پیروکاروں کو اپنی قیادت میں متحد رکھ سکے یا اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اس ضمن میں اگر دنیا کے کسی انسان کو ایک مکمل مثال یا نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے تو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ آپ اگر اپنے پیروؤں کو پانچ وقت نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں تو خود چھ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں، جس قربانی کا آپ عام مسلمانوں سے مطالبہ کرتے ہیں خود اس سے کہیں بڑھ چڑھ کہ قربانیاں پیش کرتے ہیں مسجد کی تعمیر ہو یا خندق کی کھدائی اللہ کا رسول ہر موقع پر عام مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے ایک موقع پر جب ایک صحابی جھوک کی شدت کی شکایت حضور سے کرتے ہیں اور قیص کا دامن اٹھا کر دکھاتے ہیں کہ ایک پتھر پیٹ پر باندھ رکھا ہے تو جواب میں اللہ کا رسول مسکرا کر اپنی قیص کا دامن اٹھا کر دکھاتا ہے اور لوگ دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک کے بجائے دو پتھر پیٹ پر باندھے ہوئے ہیں۔

۸ھ میں فتح مکہ کے بعد جب مسلمانوں نے ثقیف والوں کے خلاف فوجی کارروائی کی اور ان کے چھ ہزار قیدیوں کو مسلمانوں میں حسب دستور تقسیم کر دیا گیا تو ان کے اہل قبیلہ کے ایک وفد نے آکر حضور سے رہائی کی درخواست کی۔ عربوں کے لئے یہ ایک بڑی انوکھی بات تھی کہ دشمن کے قیدی بغیر کسی فدیہ کے رہا کر دیئے جائیں۔ ممکن تھا کچھ لوگ تامل کرتے لیکن آپ نے فرمایا کہ مجھ کو سنی ہاشم کے حصہ کے قیدیوں پر اختیار ہے وہ تو میں رہا کرتا ہوں اور دوسروں کے لئے سفارش کرتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ سب مسلمانوں نے اپنے اپنے حصہ کے قیدی رہا کر دیئے۔ تیسری بڑی صفت جو کسی قائد میں ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کو نہ صرف اپنی جہم کی کامیابی اور حقانیت کا کامل یقین ہو بلکہ اس کی چشم بصیرت بھی اس قدر تیز اور دور رس ہونی چاہیے جو اس کو اس کی چشم بصارت سے ان تمام مراحل و ادوار کا مشاہدہ کرادے جو اس کی تحریک کو مختلف زمانوں میں پیش آنے والے ہیں جب تک کسی قائد کو یہ چیز میسر نہ ہو وہ اپنی تحریک کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ دنیا کے عام سیاسی قائدین بھی اپنے سیاسی مطمح نظر اور منزل مقصود کے مختلف مدارج و مراحل کا کسی نہ کسی حد تک

شعور رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کے سچے نبی تھے، آپ تو اللہ رب العزت کے حکم سے اپنے مشن کو لے کر کھڑے ہوئے تھے، آپ کو تو جیسا کچھ لقیین و اذعان اپنے مشن کی کامیابی اور جس قدر بھی کامل شعور اس کے مختلف مدارج و مراحل کا ہو گا ظاہر ہے پھر مدنی زندگی میں تو اس لقیین و شعور کا پایا جانا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ وہاں تو آپ کا مشن کامیابی کے مرحلہ میں قدم رکھ ہی چکا تھا، غور کرنے کے قابل بات تو یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور میں جب جان نثاروں کی تعداد چند نفوس سے زائد نہ تھی اور ظلم و تشدد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو انسانوں کے دماغ میں آسکتی ہو اور عمل میں نہ آئی ہو، بظاہر سارے اسباب ختم ہو چکے تھے اور کوئی صورت تحریک کو آگے بڑھانے کی ممکن نظر نہ آتی تھی اس وقت بھی حضور صلعم بحیثیت سران تمام مدارج و مراحل اور ان تمام کامیابیوں کا مشاہدہ فرما رہے تھے جہاں تک تحریک کو ایک نہ ایک دن پہنچنا تھا۔

مکہ کے ابتدائی دور میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ہوا کہ کعبہ میں نماز ادا فرمائیں، آپ نے کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ سے کعبہ کا دروازہ کھولنے کی فرمائش کی، عثمان نے نہایت سختی و ترشروی سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا عنقریب یہ کعبی بہار سے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے دیں گے۔ اور فی الواقع فتح مکہ کے موقع پر یہ کعبی حضور کے تصرف میں آئی اور قربان جائیے رحمتہ للعالمین کی شان عفو و رحمت کے کہ آپ نے یہ کعبی قیامت تک کے لئے ابھی عثمان بن طلحہ اور ان کی اولاد کو مرحمت فرمائی اور آج تک اسی خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دوسرے موقع پر جب بعض مسلمانوں نے کفار کے ظلم و تشدد کی شکایت کی تو آپ نے ان کو تسلی دینے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ضرور اس ہم کو کامیاب فرمائے گا اور ایک ایسا نظام عدل و رحمت اور نظام امن و عافیت قائم ہو جائے گا کہ ایک سوار صنعا سے حضور موت تک کا سفر کرے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ سفر ہجرت میں جب عرب کا مشہور کھوجی سراقہ بن حشتم حضور کا پیچھا کرنے نکلتا ہے اور کئی بار ٹھوکر کھانے کے بعد معافی مانگ لیتا ہے تو حضور اُس کو امان عطا فرماتے ہوئے کہتے ہیں سراقہ میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ اور یہ بات تو آپ نے

مشرکین سے دوران تبلیغ کئی بار کہی کہ اگر تم میرے اس پیغام کو قبول کرو تو اس کے ذریعے تم کو سارے عرب پر بادشاہت حاصل ہو جائے گی اور دُنیا بھر کی قیادت تم کو مل جائے گی۔

ایک مدبر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ اپنے پیروؤں پر بھی مکمل اعتماد ہو، اسی طرح پیروؤں کو بھی اپنے قائد پر کامل اعتماد اور اس کی دیانت و بصیرت پر پورا وثوق ہو، اس معاملہ میں تو دنیا کے کسی انسان کی مثال اس سیاق و سباق میں دی ہی نہیں جاسکتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول تھے، ان جیسا وثوق و اعتماد کون پیدا کر سکتا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے مشن پر کامل وثوق و اعتماد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی کہ جب کفار مکہ نے وفد بنا کر آپ کے چچا ابوطالب سے درخواست کی کہ آپ اپنے بھتیجے کی اعانت و حمایت سے دست کش ہو جائیں اور ابوطالب نے بھی حضورؐ کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ بھتیجے مشکلات کا احساس کرو تو آپ نے وہ مشہور تاریخی جواب دیا تھا کہ چچا اگر یہ لوگ میرے واسطے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر مانتاب بھی لاکر رکھ دیں تو بھی میں اس کام سے رکنے والا نہیں۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ اس کام کو غالب کر دے یا میں اس میں اپنی جان کھپا دوں۔ قائد کی طرف سے اپنے پیروؤں پر اعتماد کی مثال کے طور پر وہ بے شمار احادیث کافی ہیں جن میں آپؐ نے اپنے صحابہ کی اجتماعی اور انفرادی طور پر تعریف و تحسین فرماتی ہے۔ صحابہ کے بعد اپنی امت پر آپؐ نے فخر کا اظہار فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ہمیشہ ایسے لوگ رہیں گے جو اس کام کو لے کر آگے بڑھتے رہیں گے۔

رہا قائد پیروؤں کا اعتماد تو یہ اس قدر ظاہر و باہر اور بدیہی حقیقت ہے کہ اس میں تو کسی قسم کے کلام کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ صحابہ کو حضور علیہ السلام کی سیاسی بصیرت اور تدبیر پر کس قدر اعتماد تھا، یہ ہم کو حدیبیہ کے موقع پر صاف نظر آتا ہے کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتا کہ صلح کی جو شرائط طے پا رہی ہیں ان میں اہل اسلام کے لئے کیا مصلحت ہے، شرائط بظاہر مایوس کن اور توہین آمیز ہیں، لیکن صرف قائد پر اعتماد ہے جس کی وجہ سے سب نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اور پھر ظاہر بات ہے کہ اگر مسلمانوں کو خدا نخواستہ رسول کریم صلعم

کی اخلاقی برتری اور اعلیٰ سیاسی بصیرت پر پورا پورا اور غیر متزلزل اعتماد نہ ہو تو پھر جیسا کچھ ایمان باقی رہ سکتا ہے واضح ہے لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس امر کا التزام فرماتے تھے کہ مواقع ظن سے خود بھی احتراز فرمائیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔ آپ نے کبھی بھی اس بات کا موقع فراہم نہیں ہونے دیا جس سے کسی کمزور ایمان والے شخص کو ذرا سی بدگمانی کا خدشہ ہو سکے۔ ایک بار سات گئے حضور کہیں سے واپس آ رہے تھے، ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی ہمراہ تھیں جس گلے سے آپ گزر رہے تھے اس کے اوپر والی دوسری گلے سے ایک انصاری صحابی گزرے وہ آپ کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکے اور پھر چل دیئے۔ آپ نے فوراً اُن کو آواز دی اور ٹھہرا کر فرمایا انہما ہی صفیہ بنت جیحی کہ میرے ہمراہ یہ صفیہ بنت جیحی ہیں (کوئی غیر خاتون نہیں ہیں)، اُن صحابی نے گڑگڑا کر عرض کیا یا رسول اللہ میں تو یونہی ٹھٹک گیا تھا، خدا نخواستہ میرے ذہن میں کوئی اور خیال نہ تھا۔ آپ نے فرمایا فان الشیطن یجرى من الانسان مجرى الدم (نہیں شیطان انسان کے بدن میں خون کی طرح گردش کرتا ہے) اور کوئی بھی دوسرے یا بدگمانی پیدا کر سکتا ہے۔

ایک سیاسی قائد اگر اس کا کوئی نظریہ اور اصول ہے تو اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ مضبوطی سے اپنے اصولوں پر قائم رہے اور وقتی مصالح کے پیش نظر اصولوں سے منہ نہ موڑے۔ ورنہ اس کی کامیابی اول تو ممکن نہیں اور اگر بالفرض عارضی طور پر اس کو کامیابی حاصل بھی ہو جائے تو وہ اس کے اصول اور نظریہ کی کامیابی نہ ہوگی، اس کی ذات کی ہوگی، اور ظاہر ہے کہ دیر پا اور دُور رس کامیابی وہی ہوتی ہے جو کسی اصول اور نظریہ کی بنیاد پر ہو۔ بے اصولی کامیابی تو بس خوش و خرم شروع کے شعلے مستعمل بود کا مصداق ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس معاملہ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھا جائے تو کون ہے جو اس معیار پر ٹھہر سکے جو معیار آپ نے قائم فرمایا اور آپ کے جانفیشوں نے اس کو قائم رکھا۔ اصولوں پر قائم رہنے کی مثالیں نہ صرف سیرت نبوی سے بلکہ پوری تاریخ اسلام سے اس قدر مل سکتی ہیں کہ باید و شاید یہی بات تو تاریخ میں مسلمان قوم کا امتیاز رہی ہے۔

مکہ میں ظلم و تشدد کے دور میں جب حضور علیہ السلام مختلف قبائل عرب کے سامنے اسلام کو پیش فرما رہے تھے اور ان سے یہ اپیل فرما رہے تھے کہ وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لے کر تبلیغ اسلام کا موقع بہم پہنچائیں، اس موقع پر ایک قبائلی سردار سے آپ کی ملاقات ہوئی جس نے آپ کی دعوت کو سن کر قبول اسلام اور آپ کی نصرت و حمایت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن بشرط یہ رکھی کہ آپ کے بعد جانشینی اور اختیار اس کو یا اس کے اہل قبیلہ کو حاصل ہونا ضروری ہے یہ بات آئندہ آنے والے اسلامی احکام اور روح دین سے صراحتاً متصادم تھی اور منشاء الہی بھی یہ نہ تھا کہ نبی کی جانشینی کا مسئلہ خود نبی طے کر دے، اس لئے آپ نے مذکورہ شخص کی اس پیش کش کو رد فرماتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے وہ جس کو چاہے گا حکومت و اختیار سے سرفراز فرما دے گا۔

بعد کے زمانہ کی بات ہے بنی مخزوم کی ایک معزز عورت فاطمہ بنت اسد نے پوری کی۔ مقدمہ دربار رسالت میں پیش ہوا۔ لوگوں کو خدشہ ہوا کہ اب اس کے قطع ید کا حکم صادر ہوگا۔ عورت کے اہل قبیلہ نے طے کیا کہ اس معاملہ میں حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ سے سفارش کرائی جائے جو حضور کو نہایت ہی عزیز تھے جن کو حضور نے پچپن میں بالکل اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا تھا جب یہ بچے تھے تو حضور خود ہی محبت سے ان کا ہاتھ منہ دھویا اور ناک صاف کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ بیٹا ہوتا تو ہم اس کو اچھے اچھے کپڑے پہناتے، اگر اسامہ بیٹا ہوتا تو ہم اس کو عمدہ عمدہ زیور پہناتے۔ ان اسامہ نے فاطمہ بنت اسد کی سفارش کی کہ اس کو قطع ید کی سزا سے معاف رکھا جائے۔ اسامہ کی بات سن کر چہرہ اقدس غضب و جلال سے سرخ ہو گیا اور آپ نے گرجلا آواز میں فرمایا کہ اے اسامہ تم حدود اللہ میں سفارش کرتے ہو، خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنے سے باز نہ رہتا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلی تو میں اسی لئے تباہ ہوئی کہ ان کا بڑا جب کوئی غلطی کرتا تھا تو نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور اگر کسی چھوٹے سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی تو فوراً دھریا جاتا تھا۔

ایک کامیاب سیاسی قائد اور مدبر کے لئے بڑا خطیب اور مقرر ہونا بھی ہر زمانہ ہی

۹۹

میں ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی کامیاب سیاسی قائد گزرے ہیں وہ تقصیراً سبھی قادر البیان خطیب تھے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ عکاظ و ذوالمجاز کا مبلغ، حدیبیہ کا مدبر اور مدینہ کا سردار اخطب العرب بلکہ اخطب الناس نہ ہوتا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو قوتِ بیان اور طلاقتِ لسان عطا فرمائی ہے لیکن خاتمِ الرسل آخر الانبیاء پر اللہ نے یہ صفت بھی ختم کر دی تھی۔ خود آپ نے فرمایا: انا افصح العرب کہ میں عرب میں فصیح ترین شخص ہوں۔ عرب میں زبان و بیان کے اعتبار سے دو قبیلے زیادہ نمایاں تھے۔ قریش اور ہوازن۔ قریش کے تو آپ تھے ہی اور ہوازن میں آپ نے نہ صرف اپنا بچپن گزارا تھا بلکہ اس سے آپ کا رضاعی تعلق بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور کو بارہا فی البدیہہ خطبے دینے کا اتفاق ہوا لیکن جو خطبہ دیا وہ عربی زبان کے ادبیاتِ عالیہ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

عموماً مسجد میں خطبہ دیتے وقت دست مبارک میں عصا اور میدانِ جنگ وغیرہ میں خطبہ دیتے وقت کمان ہوتی تھی۔ عموماً کسی بلند جگہ مثلاً منبر، سواری یا کسی پہاڑی وغیرہ سے خطاب فرماتے تھے۔ خطبے عموماً مختصر اور جامع ہوتے تھے۔ جو بات بیان فرماتے نہایت توجہ، جوشِ بیان، الفاظِ دیگر، خونِ جگر سے فرماتے تھے خطبہ کے نقطہٴ عروج کے وقت آواز بلند ہو جاتی تھی چہرہ مبارک غضب آلود معلوم ہوتا تھا۔ سننے والے محسوس کرتے کہ گویا آپ کسی فوج کو جنگ کے لئے اُبھار رہے ہیں۔ جوشِ بیان میں جسد مبارک ادھر سے ادھر جھوم جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک خطبہ کی حالت عبد اللہ بن عمر نے یوں بیان کی ہے: "ایک بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ دیتے سنا آپ فرما رہے تھے کہ خُداوند صاحبِ جبروت آسمانوں اور زمینوں کو اپنے قبضہٴ قدرت میں پکڑ لے گا یہ بیان کرتے ہوئے آپ نے اپنی مٹھی بند کر لی پھر آپ نے اس کو کبھی کھول کے اور کبھی بند کر کے اشارہ کیا۔۔۔۔۔ آپ کا بدن مبارک دایم سے بائیں جھوم جھوم جاتا تھا، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ منبر کا پچھلا حصہ بھی اس قدر ہل رہا تھا کہ مجھے خیال ہوا کہ منبر آپ کو لے کر گمراہ نہیں پڑے گا۔"

فنِ خطابت اور وجوہِ بلاغت کے نقطہٴ نظر سے غور کیا جائے تو خطباتِ نبوی فنِ خطابت کا معیار مٹھرتے ہیں، ایک ایک خطبہ کے معانی اور وجوہِ بلاغت پر ایک ایک دفتر تیار ہو سکتا

ہے۔ اس کے علاوہ حضورؐ کے ہر خطبہ نے ٹھیک دہی اثر سننے والوں پر مرتب کیا ہے جو حضورؐ مرتب کرنا چاہتے تھے حضورؐ کے سیاسی نوعیت کے خطبوں میں فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کا خطبہ غزوہ بحینین کے موقع پر وہ خطبہ جس میں آپؐ نے انصار سے خطاب فرمایا تھا، غزوہ بن المصطلق کے موقع کا وہ خطبہ جس میں مہاجرین و انصار کو باہمی اختلاف پر تنبیہ فرمائی تھی سیاسی تقریروں کی بہترین مثالیں ہیں۔ دینی اور مذہبی نوعیت کے خطبات کی اثر آفرینی کا تو کیا ہی کہنا ہے۔ ایک صحابی ایسے ہی ایک خطبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے بعد ایک نہایت فصیح و بلیغ اور مؤثر تقریر فرمائی جس کو سن کر سامعین کے دل کانپ اٹھے اور آنکھوں سے اشکوں کے سیل رواں جاری ہو گئے۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے اپنی تقریر میں عذابِ قبر اور امتحانِ قبر کا کچھ اس انداز سے ذکر فرمایا کہ لوگ دھڑکیں مار مار کر رونے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات میں اہم ترین اور مشہور ترین حجتہ الوداع، تنوک، فتح مکہ وغیرہ کے مواقع پر دیئے جانے والے خطبات ہیں۔ ان خطبات میں حضورؐ کی خطیبانہ شان ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

خطابت کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک کامیاب مدبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیاسی گفت و شنید میں بھی مہارت تامہ رکھتا ہو، اپنے نقطہ نظر کی حقانیت و صداقت اور اپنے برسرِ حقی ہونے کا نہ صرف اسے خود کمال یقین ہو بلکہ وہ اس کو اپنے دلائل کی قوت سے مخالف سے منوا لینے کی بھی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو، اس کی بصیرت اس درجہ کی ہو کہ وہ بروقت یہ فیصلہ کر سکے کہ کس موقع پر کیا بات مخالف سے منوائی جاسکتی ہے اور کیا نہیں، کیا بات کسی خاص مرحلہ میں اہمیت رکھتی ہے اور یہ کہ بنیادی اصولوں پر کسی طرح کا کوئی لین دین نہ ہو۔ سیاسی گفت و شنید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بصیرت کی یوں تو ہزار مثالیں موجود ہیں لیکن شاید سب سے زیادہ نمایاں مثالیں دو ہیں۔

۱۔ میثاقِ مدینہ کے نفاذ کے بعد جب آپؐ نے نہایت مختلف النوع عناصر کو محض اپنے حسن تدبیر سے یکجا کر کے ایک سیاسی و حکومتی نظم کی بنا ڈال دی، ایک قطرہ خون زمین

پر گرائے بغیر ایک نظر بیانی اور انقلابی حکومت کی اساس رکھ دی، اس کی مثال انسانی تاریخ سے پیش کرنا ممکن نہیں۔ ایک طرف مسلمانوں اور خاص طور پر مباحثہ میں کی بے سرو سامانی کا خیال کیجئے، دوسری طرف یہودیوں کی کھٹی اور پھپی عداوت کو ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد منافقین کی ریشہ دو انبان لگاہ میں لائیے، پھر آخر میں قریش مکہ کی مخالفانہ سفارتی کوششوں کو یاد کیجئے، ان سب موانع کے باوجود اتنا بڑا کارنامہ حضورؐ نے اتنی کم مدت میں انجام دیا، اس قدر مختلف اور متضاد عناصر کو ایک لڑی میں پرو دیا، اور لطف یہ کہ اختیار برتر اور اقتدار فاتح اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کے قانون کے قبضہ میں رہا۔ یہ سب حضور صلعم کی سیاسی بصیرت اور سفارتی تدبیر کا کمال نہیں تو اور کیا ہے۔ ابھی ماضی قریب میں بعض نظریاتی اور انقلابی حکومتیں دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہوئی ہیں، ان کے قائم کرنے والوں کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں اور کتنے پاپڑا ہنوں نے بیلے ہیں اور نسل انسانی کا لہو پانی کی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں ارزاں سمجھ کر جو بہایا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اور جو کچھ خیر ان کے ہاتھوں نسل آدم تک پہنچا اس سے بھی نسل آدم ناواقف نہیں۔

۲۔ سیاسی گفت و شنید کی دوسری نمایاں مثال صلح حدیبیہ ہے جس میں حضورؐ نے محض اپنے تدبیر سے خود مخالفین کے کیپ سے ان شرائط کا مطالبہ کر لیا جو اپنے فوری اور دوسرے ہر دو قسم کے نتائج کے اعتبار سے سو فی صد اسلام اور مسلمانوں کے حق میں تھیں، جبکہ مشرکین مکہ اور خود مسلمان — حتیٰ کہ حضرت عمر جیسے باخ نظر مدبر — یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ساری شرائط مسلمانوں کے لئے نہایت تو ہیں آمیز ہیں۔ لیکن معاہدے کی تکمیل کو چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے سورہ فتح کی صورت میں اس عظیم الشان کارنامہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیام تہنیت بھیجا گیا جس میں اس معاہدہ کو فتح مبین اور نصر عزیز کے الفاظ سے یاد کیا گیا چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ فتح مبین کھل کر سامنے آگئی اور محمدی بصیرت پرانلی وابدی مہر تصدیق ثبت کر گئی۔

آخری چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے تمام مدبرین کے مقابلہ میں امتیاز اور ان پر فوقیت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا قائد اور مدبر بھی کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ اپنی زندگی میں یا اپنے بعد ہی ایسے لوگ پیدا کر سکتا جو اس کے پیغام، اس کی فکر، اس کے فلسفہ، اس کے قائم کردہ نظام اور اس کے پیش کردہ طریق زندگی کی رُوح سے واقف ہوں، اُسی انداز سے اس کی اٹھائی ہوئی تحریک کو لے کر آگے چل سکیں اور اس کی جانشینی کے جملہ تقاضے پورے کر سکیں۔ اس معاملہ میں اگر کسی کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے تو صرف اس قدر کہ اس کے مرنے کے بعد دو ایک آدمی ایسے کھڑے ہو گئے جنہوں نے جس نوعی طور پر اس کے شروع کئے ہوئے مشن کی کچھ خدمت کی اور پھر وہی قحط الرجال اور بے مردمی کا عالم۔ جہاں تا بدھ، کنفیوشس اور حضرت عیسیٰ مسیح سے لے کر موجودہ زمانے کے تاؤدین تک کون ہے جس نے اپنے جیسے جانشینوں کی ایک جماعت چھوٹی ہو جس نے اپنے قائد کے مشن کو لکھا حقہ آگے بڑھایا ہو اور اپنی خطوط پر تحریک کی رہنمائی کی ہو جو قائد تحریک کے پیش نظر تھے۔

دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے اور آپ کے پاکباز ساتھیوں پر نظر ڈالئے ان میں سے ہر ایک بقول زبان وحی آسمان ہدایت کا نجم تاباں ہے۔ ان حضرات نے کہاں تک پیغام محمدی کی رُوح کا درک حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ماہرین حدیث نے تصریح کی ہے کہ صحابہ کا وہ گروہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث مروی ہے ایک لاکھ سے زائد تعداد رکھتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کے عرصہ میں کیسے ساتھی تیار کئے تھے۔ یہ حضرت ابو بکرؓ کے عزم و استقلال، حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف، حضرت عثمانؓ کی حیا اور حضرت علیؓ کی قضاء سے معلوم ہو گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ان کے بعد کیسے لوگوں نے آگے بڑھایا۔ یہ اللہ کی تلوار حضرت خالدؓ بن ولید کی شجاعت، عمرو بن العاص کی سیاست، فاتح ایران سعد بن وقاص کی عسکری قیادت سے پتہ چلے گا۔ پیغام محمدی کی رُوح کو سمجھنے والے کیسے تھے،

یہ ہم کو عائشہ اور ابو ہریرہ کے درس حدیث، ابو دردار اور زید بن ثابت کے درس قرآن، عبد اللہ بن عباس کے درس تفسیر اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن مسعود کے درس فقہ میں معلوم ہوگا۔ الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی کس کس صفت کا ذکر کیا جائے۔

۷ نہ فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگم
 کہ شتمہ دامن دل می کشد کہ جانی نجات